SHEHRI

شہری

برائے بہتر ماحول

جولائی تا ستمبر ۱۹۹۶ء

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریوں کا ایک چھوٹا سا گروہ جو شعور رکھتا ہو، وہ یقیناً دنیا کو بدل سکتا ہے... مارگریٹ میڈ

اندر کے صفحات پر

- غیر سرکاری تنظیموں کا کردار
- ماحولیاتی تحفظ اور ایڈووکیسی
- لیاری ندی
- صادقین اکادمی کی آڑ میں

گلاس ٹاورز ○ ○ ○ قانون سے بھی بلند تر

گلاس ٹاورز پراجیکٹ کے بارے میں شہری برائے بہتر ماحول کی خصوصی رپورٹ

بحیرہ عرب کے کنارے واقع کلفٹن کا علاقہ تقسیم ہند سے پہلے بھی ایک پوش رہائشی علاقہ اور کراچی کی ایک مقبول تفریح گاہ تھا۔ ایک سو فٹ چوڑی سڑک باتھ آئی لینڈ/فریئر ٹاؤن کوارٹرز کو کلفٹن پل کے قریب (پرانے) کلفٹن کوارٹرز ایریا سے ملاتی ہے جو دو تلوار سے آگے ہے۔

کراچی شہر میں جوں جوں آبادی کا ناقابل برداشت بوجھ بڑھتا رہا، اس کے نتیجے میں آئی آئی چندریگر روڈ کے کاروباری اور تجارتی علاقے میں مزید گنجائش ختم ہوتی گئی، چنانچہ ڈیولپرز نے شہر کی بڑی شاہراہوں کے کنارے ایسے رہائشی پلاٹوں کی تلاش شروع کردی جنہیں تجارتی مقاصد کے لئے بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ بینکس، صنعتی اور تجارتی دفاتر شاہراہ فیصل، عبداللہ ہارون روڈ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ اور کلفٹن جیسے بنیادی طور پر رہائشی علاقوں میں منتقل ہونے لگے چونکہ کمرشیلائزیشن میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہے اسی تناسب سے متعلقہ حکام کو بڑے پیمانے پر رشوتیں بھی دی جاتی ہیں۔

پلاٹ نمبر ۲/ایف ٹی۔۳، فریئر ٹاؤن کوارٹرز

"گلاس ٹاورز" کی داستان یوں شروع ہوتی ہے کہ پلاٹ نمبر ۲/ایف ٹی۔ ۳ (۶۳۴۴ مربع گز) جو کلفٹن روڈ پر واقع ہے۔ ۱۹۲۰ء میں کراچی میونسپلٹی نے ۹۹ سال کے لیز پر ہوشول چیلارام اور کشن چند لیکھراج کو پٹے پر دی تھی جس کا سالانہ کرایہ ۶۶ روپے دو آنے چھ پیسے تھا۔

بعد میں یہ پلاٹ مہرا اور سائیرس فرام جی مینولا کو اور اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فروخت ہوا، جنہوں نے اسے موجودہ بلڈنگ بائی لاز کے مطابق جو گراؤنڈ پلس ٹو رہائشی عمارت کی اجازت دیتے ہیں اسے اپنے دفتر کے طور پر استعمال کیا۔

شہر کی مسلسل بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر سو فٹ چوڑی کلفٹن روڈ کو ۱۹۵۰ء میں ۱۲۰ فٹ اور ۱۹۷۹ء میں ۱۵۰ فٹ چوڑا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تاہم اس قانون کی پابندی کے بجائے اس کی خلاف ورزی زیادہ ہوئی۔ سندھ بلڈنگ کنٹرول آرڈیننس ۱۹۷۹-۸۹ء کے تحت کراچی کی تقریباً ۳۵ بڑی سڑکوں کو جن میں ایم اے جناح، زیب النساء اسٹریٹ، پریڈی اسٹریٹ، فریئر روڈ، گارڈن روڈ، نشتر روڈ وغیرہ شامل ہیں، وسیع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن بلڈرز کے لالچ اور کے بی سی اے اور دوسرے سرکاری حکام کے ساتھ مجرمانہ گٹھ جوڑ کے باعث ان خلاف ورزیوں پر کوئی کارروائی نہیں کی جاسکی۔

گلاس ٹاورز

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ نے دسمبر ۱۹۹۴ء میں یہ پلاٹ میسرز پروگریسو (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۸ صباح سینٹر، بہادر آباد کراچی کو ۷۵۹۶ ملین روپے میں فروخت کردیا۔ تاہم بلڈر نے (جعلسازی کرتے ہوئے مناف حسین نامی ایک شخص کی معرفت) پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے نام سے کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کو کمرشیلائزیشن کے لئے درخواست دی اور جنوری ۱۹۹۴ء میں منظوری حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں سندھ

قانون کی بالادستی کا کھلے عام مذاق

ICUN

SHEHRI-CBE
acknowledges the support of
The Friedrich-Naumann
Foundation

بلڈنگ کنٹرول آرڈی نینس ۷۹/۸۲ء کے مطلوبہ طریق کار کی پابندی نہیں کی گئی اور زمین کے استعمال میں تبدیلی کی اجازت پی ٹی سی کو دے دی گئی (؟؟؟) جولائی ۱۹۹۵ء میں اس کے ساتھ ہی کانسیپٹ بلڈنگ پلان کی منظوری بھی دے دی گئی۔

اگست ۱۹۹۵ء میں بلڈر نے کے بی سی اے کو ملکیت کی تبدیلی کی دستاویزات پیش کیں جن میں اس جائیداد کی رجسٹریشن ۲۱/ افراد کے نام سے کی گئی تھی۔ میسرز ایکسل بلڈرز اینڈ ڈیولپرز کے محمد ہاشم ولد سلیمان صالح محمد کو ان کا اٹارنی مقرر کیا گیا تھا۔ اسی مہینے کے بی سی اے نے فائنل بلڈنگ پلان کی منظوری دے دی (جس کی ڈرا ئنگز پر اب بھی پاکستان ٹوبیکو کمپنی کا نام تھا) پلان کے مطابق تہہ خانہ' گراؤنڈ' لافٹ' چار منزلوں' ۱۰۵ کاروں کے لئے بیسمنٹ پارکنگ' ۱۳۹ دکانوں کے لئے گراؤنڈ فلور (ان میں سے کسی دکان کی اوپننگ سائیڈ یا پیچھے کی جانب نہیں ہوگی) اور چاروں فلورز پر ۵۷' ۵۷ دفاتر ہوں گے۔ بلڈر نے ایک فیصد ودہولڈنگ ٹیکس کے طور پر ۸۵۹ ۶۹۵ روپے ادا کئے (حالانکہ یہ رقم اس سے ڈھائی گنا زیادہ بنتی ہے)

کے بی سی اے کے گلاس ٹاورز

کے منظور شدہ پلان میں

خامیاں

۱) کمرشلائزیشن (زمین کے استعمال میں

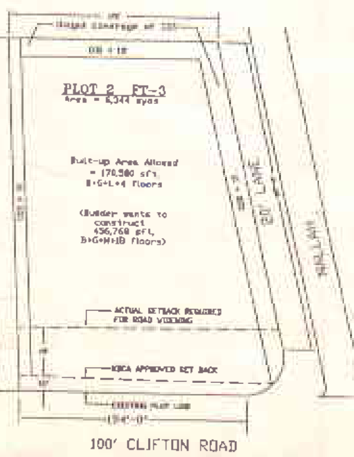

عقبی حصے میں پندرہ فٹ کے لازمی حصے کو بھی غیرقانونی طور پر ڈھانپ دیا گیا ہے

تبدیلی/ایس بی سی او۔ ۷۹/۸۲ء) ٹاؤن پلاننگ ریگولیشنز پارٹ II شیڈول ڈی پارٹ ٹو کے تحت دیئے گئے طریق کار کے مطابق نہیں کی گئی۔

۲) کلفٹن روڈ (عبداللہ ہارون روڈ) کی چوڑائی موجودہ ۱۰۰ فٹ سے بڑھا کر مستقبل میں ۱۵۰ فٹ کی جانی ہے۔

۳) بیسمنٹ میں کار پارکنگ کی جگہ ناکافی ہے۔

۴) ایس بی سی او ۷۹/۸۲ء کے تقاضے کے مطابق کے ای ایس سی کے سب اسٹیشن کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۷۰۵۸۰ مربع فٹ کی ایئر کنڈیشنڈ عمارت کے لئے ۱۳۵۰ سے ۱۷۰۰ کلوواٹ بجلی کی ضرورت پڑے گی جس کے لئے ۲۱x۱۶ فٹ کا کے ای ایس سی سب اسٹیشن درکار ہوگا جس کا سامنے کا حصہ بلڈنگ کے فرنٹ پر ہونا چاہئے۔

تعمیر

بلڈر نے عمارت کی بنیادوں کی کھدائی کا کام شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی دکانوں اور دفاتر کی فروخت کے لئے بڑے پیمانے پر تشہیری مہم بھی شروع کی گئی۔ متوقع گاہکوں کو جو "گلاس ٹاورز" کے سائٹ پر فینسی آفس میں آئے دو رنگین بروشر دیئے گئے (ایک شاپنگ مال کے لئے اور دوسرا دفاتر کے لئے) دھوکہ دینے کے لئے سائٹ پر جو ماڈل رکھا گیا تھا اس کی منظور شدہ پلان سے کوئی مشابہت یا مطابقت نہیں تھی۔ (اس میں تقریباً" ۳۵ فٹ سیٹ بیک جس میں پارکنگ سلاٹ اور کلفٹن روڈ سے پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ دکھایا گیا تھا) اٹھارہ فٹ بلند گراؤنڈ فلور' میزا نائین شاپنگ مال اور چھ' نو فٹ بلند دفاتر کے فلور دیئے گئے تھے اس طرح عمارت کی مجموعی اونچائی ۷۲ فٹ ہوتی ہے جبکہ کے بی سی اے کے منظور شدہ نقشے میں یہ صرف پچاس فٹ ہے۔

اس کے برعکس (بروشرز کے آخری صفحے پر) عمارت اور اس کے نواحی ماحول کی تصویر میں "گلاس ٹاورز" کو ایک گیارہ منزلہ عمارت دکھایا گیا ہے جس کا سیٹ بیک پی ایس او ہاؤس اور کولمبس ٹاورز کے برابر ہے۔

اس پر مزید تضاد یہ کہ بکنگ آفس گراؤنڈ اور میزانائین (دکانوں کے لئے) پہلی اور دوسری منزل پارکنگ کے لئے اور تیسری سے سولھویں منزل تک دفاتر کے لئے فروخت کررہا ہے دکانیں تقریباً" دس ہزار روپے فی اسکوائر فٹ اور دفاتر تقریباً" ساڑھے تین ہزار روپے فی مربع فٹ کی شرح سے ہوں گی۔

دسمبر ۱۹۹۵ء میں میسرز ایکسل بلڈرز نے کے ایم سی کو درخواست دی کہ انہیں گلاس ٹاورز سے ملحقہ نالے کو پارکنگ اور عوام کی تفریح کے لئے ایک چھوٹے سے پارک کے طور پر ڈیولپ کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ اجازت مل گئی اور نالے کو (جوکہ ایک پبلک سہولت ہے) بلڈر نے فوراً" آر سی سی سلیبوں سے ڈھانپ دیا تاکہ اسے تعمیراتی سامان اسٹور کرنے اور اس کی تیاری کے لئے استعمال کیا جاسکے۔

جنوری ۱۹۹۶ء کے شروع میں کے بی سی اے نے ایس بی سی او ۷۹/۸۲ء کے ریگولیشن نمبر ۲۹ کے تحت میسرز ایکسل بلڈرز کو تین دن میں اظہار وجوہ کا نوٹس دیا اور حکم دیا کہ تعمیراتی کام روک دیا جائے کیونکہ بیسمنٹ اور گراؤنڈ فلور کے کچھ حصوں میں آر سی سی کالمز اور گرڈز کی پوزیشن تبدیل کردی گئی ہے۔ نوٹس میں اس حقیقت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ عقبی

حصے میں پندرہ فٹ کے لازمی کھلے حصے کو بھی غیر قانونی طور پر کورڈ کرلیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی بلڈر نے وزیراعلیٰ سندھ کو درخواست دی کہ انہیں ۱۹ منزلہ منفرد بلڈنگ کی تعمیر کی خصوصی اجازت دی جائے جس میں پلاٹ کا تناسب ۸:۱ ہو (جبکہ قواعد صرف ۳:۱ کے تناسب کی اجازت دیتے ہیں۔) وزیراعلیٰ نے یہ اجازت دے دی۔

اس دوران نوٹس کا اطمینان بخش جواب نہ ملنے پر کے بی سی اے نے گراؤنڈ فلور پر غیر قانونی طور پر تعمیر کئے جانے والے لازمی کھلے حصے پر عمارت کا کچھ حصہ ڈھا دیا۔ جس پر بلڈر نے سندھ ہائی کورٹ میں ۲۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو ایک دیوانی مقدمہ دائر کردیا اور کے بی سی اے کے خلاف حکم امتناعی حاصل کرلیا، ڈھائی ماہ بعد کے بی سی اے نے ایک تحریری بیان کے ذریعے عدالت کو مطلع کیا کہ بلڈر نے متعدد بے ضابطگیاں کی ہیں اور اس کی بڑی بڑی خلاف ورزیوں کو ریگولرائز نہیں کیا جاسکتا۔

شہریوں کی مداخلت

ممتاز کالم نویس اردشیر کاؤس جی نے پورے معاملے کو اچھالا، ایک ہفتے کے اندر ہی وزیراعلیٰ نے ڈپٹی کمشنر (ساؤتھ) کے ذریعے "گلاس ٹاورز" کی تعمیر رکوادی اور کمشنر کراچی کو حکم دیا کہ وہ تحقیقات کریں اور خاص طور پر مطلوبہ سیٹ بیک پر توجہ دیں اور مستقبل میں سڑک کی توسیع اور اس علاقے/زون میں پلاٹ کے تناسب کے بارے میں رپورٹ کریں۔ (یہ امر قابل توجہ ہے کہ بلڈر نے وزیراعلیٰ/ ڈپٹی کمشنر کے حکم کی تو تعمیل کی اور کام فوراً "بند کردیا" لیکن کے بی سی اے کے ۴ جنوری ۱۹۹۶ء کے نوٹس کی تعمیل نہیں کی بلکہ کے بی سی اے کے خلاف مقدمہ دائر کردیا کہ اسے کارروائی سے روکا جائے) شاید کراچی شہر میں غیر قانونی تعمیرات کو کنٹرول کرنے کا کام وزیراعلیٰ کو براہ راست خود کرنا ہوگا!!

ایک اہم عنصر جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ بے تعمیراتی قوانین کی خلاف ورزی، کثیرالمنزلہ عمارتیں، تعمیر کی جارہی ہیں اور رہائشی علاقے تجارتی علاقوں میں تبدیل کئے جارہے ہیں

جنوری سے مئی ۱۹۹۶ء کی مدت کے دوران مقدمہ نمبر ۹۶/۵۵ کی کئی پیشیاں پڑیں۔ کے بی سی اے کے وکیل نے یا تو خود التوا کی درخواست کی یا ایسی درخواست سے اتفاق کیا (یہ کے بی سی اے کی "نوراکشتی" کا اسٹینڈرڈ پروسیجر ہے جس کے ذریعے بلڈر کو وقت دیا جاتا ہے کہ وہ غیر قانونی پروجیکٹ کو مکمل کرلے اور تھرڈ پارٹی قابضین کو بھی کیس میں شامل کرلے اب اس مقدمے کی تاریخ سماعت اگست ۱۹۹۶ء مقرر ہوئی ہے۔

ڈائریکٹر جنرل کے ڈی اے نے (غالباً کمشنر کی طرف سے جو کے ڈی اے کے چیئرمین بھی ہیں) ۳ جون ۱۹۹۶ء کو گلاس ٹاور کی تعمیر کو درست اور جائز قرار دے دیا کیونکہ یہ پایا گیا کہ تعمیر منظور شدہ نقشے کے مطابق ہورہی ہے اور مستقبل میں سڑک کی توسیع کے لئے دس فٹ سیٹ بیک رکھا گیا ہے (یہ غلط بیانی ہے) انہوں نے کہا کہ جنوری ۱۹۹۶ء میں کے بی سی اے نے عقبی لازمی کھلے حصے میں ناجائز تجاوزات کو گرانے کے لئے انہدام کیا تھا (حالانکہ یہ خلاف ورزی اب بھی موجود ہے) لیکن وہ یہ نشاندہی کرنے میں ناکام رہے کہ

..... وہ غیر قانونی تعمیر اب بھی موجود ہے جس کی بنیاد پر کے بی سی اے نے اظہار وجوہ کے نوٹس ایس بی سی او کے تحت جاری کئے تھے کہ "کالمز کی پوزیشن تبدیلی کی گئی ہے) اسٹرکچرل پلان کی خلاف ورزی سے پبلک سیفٹی اور پارکنگ لے آؤٹ متاثر ہوتے ہیں۔

..... گراؤنڈ فلور کی اونچائی غیر قانونی طور پر ۱۴ فٹ سے بڑھا کر سولہ فٹ کی گئی تاکہ پانچ فٹ منظور شدہ لافٹ کی جگہ ساڑھے سات فٹ کے غیر قانونی میزانائین کی گنجائش پیدا کی جاسکے۔

..... پلاٹ کے عقبی اور نالے والی سائڈ پر پندرہ فٹ کے لازمی کھلے حصے کو کورڈ کیا گیا۔

..... ہائی کورٹ میں زیر سماعت مقدمہ ۹۶/۵۵ کا ذکر جس میں کے بی سی اے کو بلڈر کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے روک دیا گیا ہے۔

..... ستونوں اور بنیادوں میں غیر معمولی طور پر بھاری ری انفورسمنٹ جو بی جی ۴ فلور عمارت کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے (جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلڈر موجودہ سرگرمی ختم ہونے کے بعد مزید تعمیر کا ارادہ رکھتا ہے)

..... سڑک کی ۱۵۰ فٹ چوڑائی کے حصول کے لئے کٹ لائین درحقیقت کم از کم ۵۰ فٹ ہونی چاہیے۔

۵ جون ۱۹۹۶ء کو کے بی سی اے نے ایکسل بلڈرز کو ایک خط کے ذریعے تعمیر جاری رکھنے کی اجازت بحال کردی۔ (یہ یقیناً ایک حیرت انگیز "نوراکشتی" ہے) ایک طرف تو کے بی سی اے غیر قانونی تعمیرات کو روکنے کے لئے بلڈر کے خلاف مقدمہ لڑ رہی ہے لیکن دوسری جانب کے بی سی اے بلڈر کو تحریری اجازت دے رہی ہے کہ وہ غیر قانونی تعمیر کا کام جاری رکھے، ہائی کورٹ اس صورت حال کو ناقابل یقین نہیں سمجھے گی؟

مہینے کے آخر میں شہری برائے بہتر ماحول نے "حقائق نامہ" جاری کیا جس میں اس "نوراکشتی" کی تاریخ وار تفصیلات دی گئی ہیں (اس کی نقول شہری کے دفاتر سے حاصل کی جاسکتی ہیں) اور اس کی نقول صدر، وزیراعظم، چیف جسٹس صاحبان، وزیراعلیٰ، گورنر، کمشنر وغیرہ تمام اعلیٰ حکام کو بھیجی گئیں۔ لیکن بے سود!!

بہرحال شہریو! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، اب بھی عدلیہ کلفٹن کے علاقے کو بچاسکتی ہے یا شاید وزیراعظم جو کلفٹن کی پرانی اور ممتاز باسی ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے محلے کے ماحول کو بچانے کے لئے مداخلت کرنے کا فیصلہ کریں۔

مثبت معاشرتی تبدیلی کے لئے

صادقہ صلاح الدین

غیر سرکاری تنظیمیں اگر کسی ایک مضبوط بندھن سے بندھی ہوئی نظر آتی ہیں تو وہ سماجی تبدیلی کی خواہش ہے۔ معاشی اور سماجی ناانصافیوں سے گھرے ہوئے اس معاشرے میں امیدوں کے یہ چراغ بہت غنیمت ہیں گو کہ ان میں سے کچھ چراغوں کی لو بہت مدھم ہے اور کچھ شام ہی سے بجھے سے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ایسے چراغوں کی بھی کوئی کمی نہیں جن کی وجہ سے دوسرے چراغ جل رہے ہیں۔ رضاکارانہ تنظیموں کی تعداد میں روزافزوں ترقی اسی عمل کا مظہر ہے۔

سماجی تبدیلی کے حصول کے لئے ان تنظیموں نے اپنی اپنی سوچ، تجربہ اور مہارت کے مطابق مختلف طریقے اختیار کئے ہیں، جس کی وجہ سے یہ تنظیمیں ہمیں انواع و اقسام کی سرگرمیوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ سرگرمیاں خواہ کچھ ہی ہوں مگر تلاش ایک ہی منزل کی ہے۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کا قیام جو جمہوری اقدار پر مبنی ہو، جہاں انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہوں اور عام شہری باعزت زندگی بسر کرسکیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سرگرمیاں خواہ وہ تعلیمی میدان میں ہوں، صحت سے متعلق ہوں یا بنیادی سہولتوں پر مرکوز ہوں، معاشرے میں خاطرخواہ سماجی تبدیلی کی نوید لاسکتی ہیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا غیر سرکاری تنظیمیں معاشرے کے اصل مسائل کو حل کررہی ہیں یا مرض کی صحیح تشخیص ہوئے بغیر صرف علامات کے علاج میں مصروف ہیں؟ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ علاج اگر صرف علامات کا ہو تو مرض باربار سر اٹھاتا ہے۔ دیرپا علاج کے لئے مرض کے اسباب کو سمجھنا اور ان کا سدباب کرنا ہوگا۔

تو پھر اب اس پر تھوڑی سی گفتگو کی جائے کہ اس معاشرے کے اصل مسائل کیا ہیں۔ کیا یہ مسائل ناخواندگی، تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی، معاشی ترقی کے محدود امکانات، صحت کا گرتا ہوا معیار وغیرہ ہیں یا یہ صرف علامات ہیں اور اصل اسباب کچھ اور ہیں۔

این جی او آر سی میں کام کرنے کے حوالے سے مجھے زندگی کی سچائیوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ گو کہ اس رابطے کو بہت عرصہ نہیں ہوا لیکن اس قلیل عرصے میں مسائل کی تہیں کھلتی ہوئی نظر آئیں۔ استحصال اور بدعنوانیوں کے ناقابل یقین مظاہرے دیکھے اور ظلم کی ہوش ربا داستانیں سنیں۔ ان کہانیوں کو دہرانا یہاں ممکن نہیں کیونکہ ان کہانیوں کے کرداروں میں کچھ باعزت افراد اور گروہوں کا ذکر بھی آتا ہے جن کی پردہ پوشی مصلحت کا تقاضہ ہے۔

میں آج ذکر صرف دیہی معاشرے کا کروں گی جہاں اکثریت ان گھرانوں کی ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا تو یہ بہت چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کے مالک ہیں یا کسی دوسرے کی زمین پر کام کرتے ہیں۔ اس طبقے میں آپ کو شاید ہی کوئی ایسا گھرانہ نظر آئے جو قرض کے بوجھ تلے نہ دبا ہوا ہو۔ یہ قرض کسی مالی ادارے کا نہیں کیونکہ وہاں تک نہ تو ان کی پہنچ ہے اور نہ ہی وہ ان اداروں کی شرائط کو پورا کرسکتے ہیں۔ ان کسانوں پر قرض علاقے کے آڑھتیوں کا ہے جو بیج اور کھاد کے لئے مالی ذرائع فراہم کرکے، ایک جانب ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور دوسری جانب سود کی زنجیروں میں ان کی آنے والی نسلوں تک کو جکڑ لیتے ہیں۔ اس غیررسمی، استحصال پر مبنی مالیاتی نظام میں ادائیگیاں اکثر جنس کی صورت میں ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان کی مالی قدر کو دیکھا جائے تو سود کی شرح ۱۰ سے ۱۲ فیصد ماہانہ تک ہوتی ہے۔ میں نے ایسے بھی واقعات سنے جب کسی نے اپنے بچے کی بیماری کی وجہ سے ۵ ہزار روپے ایک ماہ کے لئے ادھار لئے اور ایک ماہ بعد ۵ کی جگہ ٦ ہزار روپے ادا کئے۔

کہانی صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ کاشت کار کو اپنی پیداوار بھی ان آڑھتیوں کے ہاتھوں بازار سے سستے داموں فروخت کرنی ہوتی ہے اور یہ آڑھتی سناروں کی طرح اس پیداوار میں سے ضائع ہونے کا حصہ (Sastage) کاٹتے ہیں۔ ہمارے مالی ادارے جو چھوٹے کسانوں کے لئے آئے دن کم سود پر اسکیموں کا اعلان کرتے ہیں نہ جانے کن لوگوں کی مدد کررہے ہیں۔ مجھے حسرت ہے کہ میں ایسے چھوٹے کسانوں سے ملوں جو ان مالیاتی اداروں سے قرضہ لینے میں کامیاب ہوئے ہوں۔

سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ جب اس زرعی پیداوار پر سرکاری محصولات یا ڈھل آبیانہ، زمین کا لگان وغیرہ دینے کی بات آتی ہے تو استحصال کی ایک اور شکل سامنے آتی ہے۔ نظام ایسا ہے کہ کاشت کاروں کو بالکل یہ علم نہیں ہوتا کہ ان سے کس مد میں کس شرح کے مطابق ڈھل مانگا جارہا ہے۔ ڈھل کے جدول بنتے تو ضرور ہیں لیکن ان کی دستیابی بہت کٹھن ہے۔ نہ انہیں کہیں آویزاں کیا جاتا ہے اور نہ متعلقہ علاقوں میں تقسیم کرنے کا کوئی رواج ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پٹے دار اور مختیارکار مسلح پولیس والوں کے ہمراہ گاؤں میں جاتے ہیں اور کاشت کاروں کو بتاتے ہیں کہ تم پر اتنے ہزار روپے واجب ہیں۔

باقی صفحہ 18 پر

سرگرمیاں خواہ کچھ ہی ہوں، تلاش ایک ہی منزل کی ہے یعنی ایک ایسے معاشرے کا قیام جو جمہوری اقتدار پر مبنی ہو جہاں انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہوں اور عام شہری باعزت زندگی گزار سکیں

ماحولیاتی تحفظ اور ایڈووکیسی

ماحولیاتی ابتری کے خلاف جدوجہد کے لئے یہ ضروری ہے کہ معلومات عوام تک پہنچائی جائیں نوید حسین پاکستان کی سیاسی معاشرتی اور معاشی صورتحال کے تناظر میں ماحولیاتی ایڈووکیسی پر روشنی ڈالتے ہیں

عوامی مسائل کی وکالت دنیا بھر میں کی جاتی ہے' لیکن یہ مخصوص معاشروں اور اس کے اداروں میں کی جاتی ہے' لہٰذا حکمت عملی پر غور کرنے سے پہلے دونوں مسئلوں یعنی ایڈووکیسی اور ماحول کا الگ الگ جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایسا کرنا ناگزیر ہے کیونکہ وکالت اور ماحول دونوں کو پاکستان کے سماجی اور اقتصادی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے برعکس ہم ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کو شدید پابندیوں اور محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے کام کرنا پڑتا ہے۔

تعریف کے مطابق ایڈووکیسی نام ہے کسی حقیقی یا متوقع تکلیف یا شکایت کو مناسب فورم پر پیش کرنے اور غلط کاموں کو درست کرانے کی کوشش کرنے کا۔ اس کام میں کم از کم پانچ بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اول ہمارے ہاں سنکیت اور لاپرواہی ہے جس کی وجہ سے رائے عامہ اور حمایت کو متحرک کرنا بہت مشکل ہے یہ اس رویئے سے پیدا ہوتی ہے کہ "کیا فائدہ کچھ بھی تو نہیں بدلے گا۔" یہ رویہ طویل عرصے تک سیاستدانوں' مملکت' ذرائع ابلاغ' مذہبی رہنماؤں اور دیگر رائے عامہ کے لیڈروں کے ہاتھوں پے در پے چوٹیں کھانے اور دھوکہ اٹھانے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام حقیقی کوششوں پر بھی شک کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ان لوگوں پر بھی شک و شبہے کا اظہار کیا جاتا ہے جو تبدیلی لانے کی حمایت کرتے ہیں۔

دوسرے یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں خواندگی کی شرح صرف ۳۱ فیصد ہے۔ عوام کا ایک بڑا حصہ انتہائی غربت کے عالم میں زندگی بسر کرتا ہے' جہاں ساری جدوجہد صرف بقائے حیات کے لئے ہے جہاں ماحولیاتی مسائل ترجیحات کی فہرست میں اوپر نہیں ہیں۔ یہ کہنا انتہائے سادگی نہیں کہ جہالت اور غربت ناروا داری کو پروان چڑھاتے ہیں اصل مسائل مثلاً ماحولیات اور انسانی حقوق کا احترام وغیرہ کو نان ایشوز (غیر حقیقی مسائل) کے پردے میں چھپا دیا جاتا ہے۔ ایڈووکیسی کے لئے عوام کی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے اور جب قوم نسلی' فرقہ وارانہ اور جنس کی بنیاد پر بٹی ہوئی ہو تو یہ کام اور بھی زیادہ کٹھن ہو جاتا ہے۔

تیسرے پاکستان چونکہ اب بھی ایک نیم قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ریاست اور اس کے اداروں میں ایک پدرانہ رویہ پیدا ہو گیا ہے جسے "میں سب سے بہتر جانتا ہوں" کے کلیشے میں بآسانی سمیٹا جا سکتا ہے۔ جہاں حکومت کی پالیسیوں اور موجودہ صورت حال کے بارے میں سوال کرنا غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ شہریوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں مملکت کی حمایت درکار ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں اس کا فقدان ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سیاستدان اور افسران مفاد پرستوں کے ساتھ مل کر اور ان کی سرگرمیوں میں شریک ہو کر ماحولیاتی انحطاط سے مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔

چوتھے معاشرے کا ایک چھوٹا لیکن طاقتور طبقہ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرنے کا اتنا عادی ہے کہ وہ پورے معاشرے اور ماحول کی قیمت پر بھی اپنی مرضی کے مطابق راہ اختیار کرتا ہے کیونکہ یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ غیر قانونی طور پر بھی مالی فوائد حاصل کرنا اس کا حق ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کے اس طبقے سے شاید ہی کوئی حمایت مل سکے۔ جو لوگ ایڈووکیسی کر رہے ہیں دراصل وہ موجودہ صورت حال کو چیلنج کر رہے ہیں اور وہ بھی اس مسئلے کا ایک حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں انحصار کا کام ہے۔ یہ انحصار معاشرے کے اس طبقے کے حوالے سے ہے جو مسائل کے حل کے لئے صرف مسلسل حکومت کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اس ہلاکت خیز رویئے سے چھٹکارا پانا ہوگا اور شہریوں کو یہ احساس کرنا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی خود سنواریں' اپنے مسائل خود حل کرنا سیکھیں بجائے اس کے کہ وہ ریاست یا کسی بیرونی مداخلت کی کارروائی کا انتظار کریں۔

ماحولیاتی تحفظ کے لئے مستقل ترقی کی ضرورت ہے۔ نسلوں کے درمیان مساوات ایک ایسا مسئلہ ہے جو اب بہت زیادہ سامنے آتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اب یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ ترقیاتی حکمت عملی طے کرتے وقت قدرتی وسائل کے حوالے سے آنے والی نسلوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھا جائے۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھا جائے کہ پاکستان کی آبادی ۱۴۰ ملین نفوس ہے اور ہمیں ہر سال ۴ء۲۵ ملین اضافی افراد کی خوراک کا انتظام کرنا ہوگا۔ قابل کاشت اراضی پر بہت زیادہ دباؤ ہے اور ملک اس وقت بھی اور آئندہ اور زیادہ اشیائے خوراک کا امپورٹر بن جائے گا۔ اگر ناخواندگی' آبادی میں بے تحاشہ اضافے اور آمدنیوں میں عدم تفاوت کی موجودہ سطح برقرار رہی تو ماحول پر اور زیادہ دباؤ پڑے گا' کیونکہ زمین اور اس کے محدود وسائل پر دباؤ بڑھتا چلا جائے گا۔

شہری علاقوں میں ماحولیاتی انحطاط کے نتیجے میں گنجان آباد کچی بستیاں وجود میں آرہی ہیں جو نہ صرف پینے کے صاف پانی اور سیوریج کی سہولتوں سے محروم ہیں بلکہ کسی منصوبہ بندی کے بغیر پھیلتی جارہی ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک شہروں میں تیزی سے آبادی کی نقل مکانی کے سبب ۱۶۵ ملین آبادی کا ۴۵ فیصد شہروں میں رہ رہا ہوگا۔

ایک ایسی دنیا میں جو ماحول کے بارے میں بڑی فکرمند ہے جو قومیں اپنے ماحول اور انسانی حقوق کے مسائل کو نظرانداز کریں گی وہ سرمایہ کاری تک رسائی کے معاملے میں دنیا سے الگ تھلگ ہوتی چلی جائیں گی۔ ماحولیاتی انحطاط کی وجہ سے برآمدی مارکیٹوں یا سرمایہ کاری سے محروم ہو جانے کا عمل تو پہلے ہی شروع ہو چکا ہے اور اس بنیاد پر پاکستان کو قالین

سازی' جراحی کے آلات اور ماہی گیری کے شعبوں میں نوٹس دیا جاچکا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم بہتر ماحول کی ایڈووکیسی کیونکر کریں؟ بظاہر تو راستہ یہی ہے کہ پرنٹ میڈیا کے ذریعے' لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواندگی کی شرح کم ہو یہ پیغام محدود حلقے تک ہی پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بعد سیمینارز' ورکشاپس' عوامی سماعتیں آتی ہیں یہ بھی عوام کی ایک محدود تعداد کو کور کرسکتے ہیں۔ البتہ یہ ایسے فورمز کا کام انجام دے سکتے ہیں جہاں سے شعور عامہ بیدار کرنے' معلومات پھیلانے اور فیڈ بیک حاصل کرنے کا کام کیا جاسکتا ہے۔ عوامی نمائندوں سے رابطہ بظاہر ایڈووکیسی کا ایک سیدھا سادھا طریقہ ہے لیکن ہمارے ملک کے مخصوص حالات میں یہ بھی محض وقت کا زیاں ہے' کیونکہ ہمارے منتخب نمائندے نان ایشوز میں گھرے رہتے ہیں یا اقتدار کی رسہ کشی میں لہٰذا ان کی دلچسپیاں اور فوکس کہیں اور ہوتا ہے۔

فلم شوز ایڈووکیسی کا ایک پرکشش' معلوماتی اور تفریحی ذریعہ بن سکتے ہیں' ایک ایسے معاشرے میں جہاں تعلیم ہر شخص کی پہنچ میں نہ ہو یہ ایک طاقتور ہتھیار بن سکتے ہیں ٹی وی کا میڈیا اب بھی این جی اوز کی دسترس میں نہیں ہے کیونکہ یہ ریاست اور طاقتور پیوستہ مفاد کے خلاف ایک موثر خطرہ بن سکتا ہے۔

جب طاقتور پیوستہ مفاد سے مقابلہ ہو تو ایسی صورت میں دوسری شہری تنظیموں کے ساتھ رابطہ اور اشتراک ضروری ہوجاتا ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر ایک وسیع تر پلیٹ فارم تشکیل دینا ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گزشتہ سال "شہری" نے کراچی ماس ٹرانزٹ پروجیکٹ کے بارے میں بحث کے لئے ایک پلیٹ فارم کے قیام میں مدد دی۔ شہری اس پروجیکٹ کے روٹس پر ماحولیاتی نتائج کے بارے میں ناخوش تھے اور اس سلسلے میں زیادہ ٹرانسپرنسی چاہتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ

ہمارے یہاں ماحولیاتی مسائل ترجیحات میں سرفہرست ہیں جہالت اور غربت ناروا داری کو پروان چڑھاتے ہیں جبکہ ایڈووکیسی کے لئے عوام کی حمایت ضروری ہوتی ہے

منصوبے پر نظرثانی کی جائے اور سرکلر ریلوے کو کے ایم ٹی پی سے مربوط کیا جائے جو بہت کم لاگت سے کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح عوام کے دباؤ کی وجہ سے ملک عالمی بینک سے ایک ارب ڈالرز کا قرضہ لینے سے بچ گیا اور بالآخر عالمی برادری نے اس منصوبے میں سرمایہ کاری کی پیشکش کی۔

ملک کے تمام حصوں میں شاخیں قائم کرکے پبلک آؤٹ ریچ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور اس سے تنظیموں کی عدم مرکزیت میں بھی مدد ملتی ہے۔ قانونی وکالت اس ملک میں ایک سست رفتار اور مہنگا طریقہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ "حکم امتناعی" حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اکثر اس کی بھی خلاف ورزی کی جاتی ہے' کیونکہ عدلیہ کو بھی اپنے عدالتی احکامات پر عملدرآمد کے لئے ریاستی اداروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

این جی اوز کے پاس محدود فنڈز ہوتے ہیں وہ تمام رقم مقدموں پر نہیں لگا سکتیں' عوامی ایڈووکیسی کے لئے یہ ذہانت ضروری ہے کہ ایک مخصوص صورت حال سے کس طرح نمٹا جاسکتا ہے اور کم سے کم وسائل کے ذریعے کس طرح اپنا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

انسانی وسائل کا بدل کوئی چیز نہیں ہوسکتی' کیونکہ اگر عوام کو متحرک کرنے میں کامیابی ہوجائے تو بہت سی مشکلات سر ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا سہمی یا کمیونٹی ڈیولپمنٹ ورک عوام کو متحرک کرنے کا سب سے موثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعے انہیں مسائل سے نمٹنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے پاکستان کے بعض نمائشی منصوبے مثلاً اورنگی پائلٹ پروجیکٹ وغیرہ این جی اوز کے کام کے حوالے سے اسی علاقے میں موجود ہیں۔

کمیونٹی کے کام کے لئے رویئے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ کمیونٹی کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہمیں اپنے محدود معاشی وسائل کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ مقاصد حقیقت پسندانہ ہوں اگر غیرحقیقت پسندانہ مقاصد ہوں تو اس سے ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہم جس کمیونٹی کے ساتھ کام کررہے ہیں اس کے بارے میں ہمارا رویہ ہمدردانہ اور مفاہمانہ ہونا چاہئے۔

آخر میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ماحول کی وکالت بھی' انسانی' اقلیتی حقوق کی وکالت یا اخبارات کے لئے کام کرنے والوں کی طرح ایڈووکیسی کرنے والے کو حقیقی خطرات سے دوچار کرسکتی ہے۔ ماحولیاتی انحطاط سے بہت دولت کمائی جاتی ہے اور اس ذریعے کو ختم کرنے کے لئے بہت طاقتور گروپوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرد یا این جی او ایسی صورت حال نہیں پیدا کرنا چاہتی جس میں انسانی زندگیوں کو خطرہ ہو' لیکن مفاد پرستوں کو سخت پیغام دینے کے لئے ایسے بھی حالات ہوتے ہیں جہاں حقیقی محاذ آرائی ہوتی ہے' اگر کوئی شہری گروپ اس خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرکے جیت جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے ہارا ہوا علاقہ پھر جیت لیا ہے اور یہ اس کمیونٹی کی حقیقی فتح ہوتی ہے۔ □

بن قاسم پر کے ای ایس سی کے پاور پلانٹ سے اٹھنے والی آلودگی

کھلونے بنانے کے لئے امریکی ٹھیکے

غریب ایشیائی ممالک میں کھلونے بنانے والوں کو قلیل معاوضہ دیا جاتا ہے' ہمارا مطالبہ ہے کہ ایشیا میں مزدوری کے مناسب معیار اختیار کئے جائیں

مجھے تمہاری دوکان کے کھلونے نہیں چاہئیں "پچھلے برس یہ بات الی نوائے سے ایک دس سالہ بچے نے ارکنساس سے تعلق رکھنے والی رعایتی نرخوں کی دوکان کے سلسلے میں وال مارٹ کو لکھی۔ اس بچے نے تھائی لینڈ میں تیار "پاور رینجر" واپس کردی۔

وال مارٹ کو اس بچے کا یہ خط صارفین کے لئے ایک تحریک کا حصہ تھا جس نے انسانی حقوق کے کارکن کھلونے بنانے والی ان امریکی کمپنیوں کو نشانہ بنا رہے ہیں جو تیاری کا کام ایشیائی ممالک میں ٹھیکے پر دے دیتی ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ یہ امریکی کمپنیاں ایسا ضابطہ اخلاق بنائیں جس میں اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ایشیا میں کام کو آگے ٹھیکہ پر دینے والے مزدوری اور تنخواہوں کے بین الاقوامی معیار کو پورا کریں گے۔

مزدوروں کے حقوق پر کام کرنے والوں کے مطابق ایشیا میں کھلونے بنانے والے' جن میں تقریباً" نوے فیصد عورتیں ہیں' قلیل تنخواہوں پر روزانہ دس سے چودہ گھنٹے' ہفتے میں چھ یا سات دن کام کرتے ہیں۔ ان مزدوروں کو کوئی اوورٹائم نہیں دیا جاتا اور حفظان صحت' رہائش اور علاج کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ کارخانوں میں اکثر حفاظتی ساز و سامان نہیں ہوتا۔ امریکن فیڈریشن آف لیبر اینڈ کانگریس آف انڈسٹریل آرگنائزیشنز' جو کہ امریکہ میں بڑی ٹریڈ یونین ہے' کی شیرول گو یو کہتی ہیں "امریکہ میں ایک متوسط طبقے کا بچہ سال بھر میں ۳۰۰ ڈالر سے زیادہ کے کھلونے خریدتا ہے جبکہ غریب ایشیائی ممالک میں کھلونے بنانے والوں کو ایک ڈالر فی گھنٹہ سے بھی کم معاوضہ ملتا ہے" یہ مناسب نہیں' ہم چاہتے ہیں کہ کھلونے بنانے والی کمپنیاں ایشیا میں مزدوری کے مناسب معیار اختیار کریں"۔

تھائی لینڈ اور ایشیا کے دیگر حصوں کے کھلونوں کے کارخانوں میں کام کرنے والی ہزاروں لڑکیوں اور عورتوں کو دن کے چودہ گھنٹے کام کرنے کا معاوضہ صرف پانچ امریکی ڈالر دیا جاتا ہے اور برسلز میں قائم انٹرنیشنل کنفیڈریشن آف فری ٹریڈ یونین (ICFTU) کے مطابق کئی کارکنوں کو زیادہ اجرت طلب کرنے پر نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ صارفین کے گروپ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ امریکی کمپنیاں ایسا ضابطہ اخلاق نافذ کریں جو اجرت اور تحفظ کے قوانین کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ امریکی کمپنیاں ان قوانین کا جائزہ لینے پر رضامند ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایشیا میں کھلونوں کے زیادہ تر کارخانے امریکہ' یورپ یا جاپان کی کثیرالقومی کمپنیوں کی ملکیت ہیں یا پھر ان کے ٹھیکے پر ہیں۔

آئی سی ایف ٹی یو کے جنرل سیکریٹری بل جارڈن کہتے ہیں "ان کارخانوں میں کام کی صورت حال بین الاقوامی طور پر متفقہ بنیادی معیار پر بھی پورا نہیں اترتی' پچھلے دو برس میں چین اور تھائی لینڈ میں ۲۵۰ سے زیادہ مزدور آگ یا دیگر صنعتی حادثوں میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ٹریڈ یونین والے کارخانوں میں آگ کے لئے کثیرالقومی کمپنیوں اور علاقہ کی حکومت کو برابر کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں"۔

چین اور تھائی لینڈ کے افسران یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صنعتی حادثات ناکافی حفاظتی انتظامات کی وجہ سے ہوئے' لیکن اے ایف ایل سی آئی او کے کارکنان کہتے ہیں کہ بیرونی سرمایہ کاروں کو خوش کرنے کے لئے یہ لوگ حفاظتی قوانین کی خلاف ورزی کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

کھلونوں کے خلاف مغربی تحریک میں ایشیا کے انسانی حقوق کے مقامی علمبردار سب کے سب شامل نہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حالات خراب ہیں اور بہتری ہونی چاہئے' مگر ان کا کہنا ہے کہ کارخانے بند

کر دینے سے ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جائیں گے۔ ان کے مطابق استحصال وسیع تر معاشی صورت حال کا حصہ ہے جو کہ معیار زندگی بلند ہونے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ گریو کہتی ہیں "حکومتیں بیرون ملک سے آنے والی کاروباری سرمایہ کاری میں مزدور کے تحفظ سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں یہ جانتے ہوئے مغربی کمپنیاں خطرناک کارخانوں یا کارکنوں کی صحت کے بارے میں فکرمند نہیں ہوئیں"۔

مئی ۱۹۹۳ء میں تھائی لینڈ کی کیدر ٹوائے فیکٹری میں آگ لگنے سے ۱۸۰ سے زیادہ کارکن ہلاک ہو گئے تھے۔ کیدر امریکہ کی کھلونوں کی صنعت میں سب سے بڑا ناموں کے لئے مال تیار کرتی ہے جن میں امریکہ کے کسٹم کے ریکارڈ کے مطابق آرکو' کیز' گنڈ ۔ جے سی پینی' حسبود' ٹوائز آر یو ایس' فشر پرائس اور ٹائیکو شامل ہیں۔ آئی سی ایف ٹی یو کی طرف تفتیش کے لئے جانے والوں نے ۱۹۹۳ء کے اواخر میں آگ لگنے والی جگہ کا معائنہ کیا اور کہا کہ کیدر میں کام کرنے والے زیادہ تر کارکن کنٹریکٹ کی بنیاد پر کام کر رہے تھے اور روزانہ ۴ ڈالر سے کم اجرت پاتے تھے۔

ان حالات کے برعکس' کثیرالقومی کمپنیوں کے منافع میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے ٹوائے مینوفیکچررز آف امریکہ جو کہ نیویارک میں قائم صنعتی تجارت کا گروپ ہے کے مطابق ۱۹۹۵ء میں امریکی کمپنیوں نے ۲۰ ملین امریکی ڈالر کی فروخت کی۔ ۱۹۹۴ء میں ان کا کل منافع ۹۰۰ ملین ڈالر تھا۔ جو کہ یورپی اور جاپانی کمپنیوں کے کل منافع سے ۳۰ فیصد زیادہ تھا۔ ٹی ایم اے نے اس مطالبے پر کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا جن کے مطابق اس کے ارکان کو کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے کارخانوں میں کام کے حالات کا آزادانہ جائزہ لینے کی اجازت دیں لیکن اس کے نمائندہ جوڈی لیون نے آئی پی ایس کو بتایا "ہمارا اپنا ضابطہ اخلاق ہے جو کہ بہت کافی ہے"۔

ایشیا میں کام ٹھیکہ پر دینے والی بڑی کمپنیوں میں امریکہ کی میٹل اور ٹوائز آر یو ایس جبکہ جاپان کی حسو' بنڈائی' نانمننڈ اور سیگا شامل ہیں۔ سستی اجرت اور حفاظت اور اجرت کے قوانین کے کمزور نفاذ کی کشش میں ان میں سے کچھ کمپنیاں چین' تھائی لینڈ' ملائشیا' تائیوان' ہانگ کانگ' جنوبی کوریا اور فلپائن میں تیاری کا کام ٹھیکہ پر کروانے پر بہت انحصار کر رہی ہے۔ آئی سی ایف ٹی یو۔ کی ایک حالیہ تحقیق کے مطابق "برطانیہ میں بکنے والے کھلونوں میں ۷۵ فیصد ایشیا میں بنے ہوئے ہیں"۔

کچھ عرصہ پہلے ایک بیان میں آئی سی ایف ٹی یو کے جنرل سیکریٹری بل جارڈن نے کہا "یہ ثابت کرنا کمپنیوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کا ٹھیکہ دار کم از کم معیار کو پورا کرتا ہے۔ انہیں ضمانت دینا چاہئے کہ ان کی مصنوعات بے گار خانوں کے سے ماحول میں تیار نہیں ہوتیں"۔

یہاں کے اے ایف ایل' سی آئی او کے سرگرم ارکان کہتے ہیں کہ آئی سی ایف ٹی یو اور مزدوروں کے حقوق کے آواز بلند کرنے والے دیگر گروپوں کے دباؤ کے نتیجے میں بہت سی یورپی کمپنیاں ایسے ضابطہ ہائے اخلاق بنا رہی ہیں۔ جن سے اجرت اور حفاظت کے قوانین کا نفاذ یقینی بن جائے۔ لیکن ان کی شکایت یہ ہے کہ امریکی کمپنیوں کا ردعمل مایوس کن ہے۔

گریو کہتی ہیں "ابھی تک ہم نے کسی کمپنی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا" "ہاں" ہم یہ کریں گے۔

شیاپس (میکسیکو) کی ایک بچی مچھلی کے آرپار ہونے والے تیر پر دکھی ہے' میکسیکو کا لاکادون قبیلہ بارانی جنگلات اور آبی حیات کو بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے

بینک فاریسٹ پارکس کی ترقی میں مدد دیں گے

ڈان میں حال ہی میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق نیشنلائزڈ بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے فاریسٹ پارکس اسکیم کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے پروگرام میں مدد دیں گے۔ یہ فاریسٹ پارکس کے ڈی اے اور کے ایم سی کی جانب سے پارکوں اور اسپورٹس کمپلیکس کے لئے مختص کی جانے والی زمینوں پر ان علاقوں میں قائم کئے جائیں گے جو کم ترقی یافتہ اور پسماندہ ہیں۔ کراچی میں فاریسٹ پارکس قائم کرنے کا فیصلہ گزشتہ ماہ پاکستانی تحفظ ماحولیات کونسل کے سربراہ نے کیا تھا۔

دریں اثناء ماحولیات' شہری امور' جنگلات اور جنگلی حیات کی وزارت کے سیکریٹری ایم سلیمان فاروقی نے ڈویژنل کمشنر کراچی ضیاء الاسلام کو بہتر نتائج کے حصول کے لئے کو آرڈی نیٹر مقرر کیا ہے۔ نیشنل بینک کو دو فلاحی پلاٹ دیئے گئے ہیں۔ پہلے یہ پلاٹ (ایس ٹی ۔۵ اور ایس ٹی ۔۱) کلاسن میں ایک اسپورٹس کمپلیکس کی تعمیر کے لئے مختص کئے گئے تھے جو کے ایم سی کو تعمیر کرنا تھا۔ نیشنل بینک کے پلاننگ کے ماہرین اس پر کام کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ اس منصوبے پر اسی ماہ کے دوران کام شروع ہو جائے گا۔

مسلم کمرشل بینک نے ناظم آباد میں "ابن سینا پارک" کو فاریسٹ پارک میں تبدیل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

انٹرویو

رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود کراچی واٹر اور سیوریج بورڈ نے ترقی کی ہے

گلزار احمد میمن

انجینئر گلزار احمد میمن کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے ایک سینئر افسر اور کے ڈبلیو اینڈ ایس بی انجینئرز اینڈ آفیسرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ وہ بورڈ کے معاملات کے بارے میں شہری سے بات چیت کرتے ہیں۔

○ سوال۔ کراچی میں پانی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کے ڈبلیو اینڈ ایس بی کن بڑے منصوبوں پر عمل کر رہی ہے؟

☆ جواب۔ ہم اس مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹا رہے ہیں' کراچی کی آبادی میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا ہے لہٰذا طلب اور رسد میں فرق موجود ہے۔ اس وقت کے ڈبلیو اینڈ ایس بی کراچی کو ۴۴۴ ملین گیلن پانی روزانہ فراہم کر رہا ہے جبکہ شہر کی ضرورت ۵۵ ملین گیلن یومیہ ہے۔ تاہم بڑے منصوبوں پر کام جاری ہے تاکہ اس فرق کو کم کیا جا سکے اور تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود اس سلسلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی جا رہی ہے۔ عالمی بینک کی مدد سے دریائے سندھ سے مزید ایک سو ملین گیلن یومیہ پانی حاصل کرنے کا منصوبہ تعمیر کے ایڈوانس اسٹیج میں ہے۔ توقع ہے کہ یہ منصوبہ ۱۹۹۸ء میں مکمل ہو جائے گا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً" ۳۰ فیصد پانی رساؤ کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے "آبی نقصان کم کرنے" کے منصوبے پر بھی عمل ہو رہا ہے۔

○ سوال۔ سیوریج کا غلط اور غیر موزوں طریقے سے جمع کرنا اور ٹھکانے لگانا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جس کی وجہ سے صحت اور ماحول کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ کے ڈبلیو اینڈ ایس بی اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے کیا کر رہا ہے؟

☆ جواب۔ کے ڈبلیو اینڈ ایس بی اس مسئلے سے آگاہ ہے اور حال ہی میں دو موجودہ ٹریٹ منٹ پلانٹس کو جو محمود آباد اور سائٹ میں واقع ہیں بحال کیا گیا ہے اور ان کی ٹریٹ منٹ کی استعداد کو ۴۰ ایم جی ڈی سے بڑھا کر ۹۷ ایم جی ڈی کر دیا گیا ہے۔ ۵۴ ایم جی ڈی استعداد کا ایک اور ٹریٹ منٹ پلانٹ ماری پور میں تعمیر کیا جا رہا ہے۔ کے ڈبلیو اینڈ ایس بی کراچی کے بڑے پارکوں میں استعمال شدہ پانی کی ری سائیکلنگ کے سات منصوبوں کی بھی نگرانی کر رہا ہے۔ یہ پلانٹ استعمال شدہ پانی کو ری سائیکل کریں گے جسے ان پارکوں کی آب پاشی کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اس طرح ساڑھے تین لاکھ گیلن پانی کی یومیہ بچت ہوگی جو پینے کے لئے دستیاب کیا جائے گا۔ نئے ٹرنک سیور بھی بچھائے جا رہے ہیں سیوریج کی صفائی کے آلات درآمد کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ برسات کے موسم کی تیاری کے سلسلے میں حال ہی میں سیورز اور نالوں کی بڑے پیمانے پر صفائی کے پروگرام پر عمل کیا جا رہا ہے۔

> کراچی کی آبادی میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس وقت شہر کو ۴۴۴ ملین گیلن پانی روزانہ فراہم کیا جا رہا ہے جبکہ کراچی کی ضرورت ۵۵۰ ملین گیلن یومیہ ہے

○ سوال۔ کے ڈبلیو اینڈ ایس بی ناجائز کنکشن اور پانی کی چوری جیسے مسائل سے نمٹنے کے لئے کیا کر رہا ہے؟

☆ جواب۔ کے ڈبلیو ایس بی کے نئے چیئرمین سید راحیل شاہ نے حال ہی میں پانی کی چوری روکنے' غیر قانونی کنکشن کاٹنے اور غیر قانونی ہائیڈرینٹس کو سیل کرنے کے لئے ایک ایکشن پروگرام شروع کیا ہے۔ بلدیہ ٹاؤن میں ایک ہائیڈرینٹ سربمہر کر دیا گیا ہے ہم نے شہر کے مضافات میں چھ پمپنگ مشینیں ضبط کی ہیں جس کے ذریعے غیر قانونی طور پر مین سپلائی لائین سے پانی حاصل کر کے پانی کے کھیتوں کو فراہم کیا جاتا تھا۔ اندازہ ہے کہ ان پمپوں سے ۲۶۸ ملین گیلن پانی روزانہ چوری کیا جاتا تھا۔ اب تک کے ڈبلیو اینڈ ایس بی ساڑھے تین ہزار کنکشن منقطع کر چکا ہے جن میں درجنوں ایسے فلیٹ سائیٹس بھی شامل ہیں جنہیں بالمجھی کنڈیوٹیٹ سے براہ راست ملا دیا گیا تھا' ان میں سے بیشتر گلشن اقبال میں تھیں بعض صنعتی اور تجارتی اداروں کے خلاف بھی کارروائی کی گئی ہے۔

○ سوال۔ کہا جاتا ہے کہ کے ڈبلیو اینڈ ایس بی کے افسران محلوں کی سطح پر شہریوں کی شکایات پر پوری طرح توجہ نہیں دیتے۔

☆ جواب۔ تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن کارروائی ضرور ہوتی ہے کے ڈبلیو اینڈ ایس بی بھی دوسرے سرکاری محکموں کی طرح ہے اور ضرورت سے زیادہ سرخ فیتے کی وجہ سے اس کے کام میں بھی رکاوٹ پڑتی ہے' ہمیں ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی دباؤ کے تحت کام کرنا پڑتا ہے عوام کو اس کا احساس ہونا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ پانی کی طلب اور رسد میں خاصا فرق ہے اور جب تک یہ فرق دور نہ ہو مسائل تو پیدا ہوتے رہیں گے۔ ضروریات پوری کرنے

باقی صفحہ 18 پر

تحریر : ش۔ فرخ

صادقین اکیڈمی کی آڑ میں

اس شام صادقین بہت یاد آئے

کچھ عرصہ قبل گلشن اقبال سے شہر کی جانب 'نیپا چورنگی کے قریب سے گزرتے ہوئے صادقین کے نام کے حروف انگریزی میں لکھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خیال آتا' شہر کی گھما گھمیوں سے دور' کبھی لاہور کی شملہ پہاڑی کے اوپر کبھی فریئرہال کراچی کی عمر رسیدہ عمارت کے نیچے گزر بسر کرنے والے صادقین بھلا سرباز ار کیا کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی موقع نہ ملا کہ جا کر معلوم کروں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

یہ تجسس اس وقت پھر سے جاگ اٹھا جب اسی گزرگاہ سے سفید براق چادروں سے ڈھکے میزوں پر سرخ رومال سجے دکھائی دینے لگے۔ لیکن اس وقت تک سمجھ نہ آسکا جب تک کہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں صادقین شادی ہال میں داخل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا۔ اب اس نقارخانے کی بیرونی دیوار پر صادقین اکادمی اور صادقین کیلی گرافی اسکول کے بورڈ آویزاں ہیں۔

زندہ قومیں اپنے ادیبوں اور فنکاروں کی یادگاریں بنایا ہی کرتی ہیں۔ ان کی پزیرائی کسی نہ کسی طور ہوتی رہتی ہے۔ ان کے نام کو زندہ رکھنے اور انہیں یاد کرنے کے سو بہانے۔ یہ لوگ قومی ورثہ ہوتے ہیں۔ ماضی کے خزینے ہوتے ہیں۔ انہیں "آئندہ نسلوں" سے متعارف کروانے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ تو ہونا چاہئے۔

اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرا کی پرنسز اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر جارج ایلیٹ کا یادگاری بینچ نظر آیا۔ یارک شائر کے چھوٹے کے قصبے ہاورتھ میں شارلٹ اور ا۔ یملی کے والد' انیسویں صدی کے پادری کا گھر برانٹے میوزیم ہے۔ برمنگھم سے 30 میل دور اسٹریٹ فورڈ اپون ایون ولیم شیکسپیئر کا مقام پیدائش ہے۔ یہاں پر رائل شیکسپیئر تھیٹر ہے۔ جہاں دنیا بھر کے سیاح تھیٹر دیکھنے آتے ہیں۔ ہجوم کا یہ عالم ہے کہ یہاں کئی کئی برسوں تک بکنگ نہیں ملتی۔ یہیں پر 23ر اپریل کے لگ بھگ ہر سال قدیم روایات کے مطابق شیکسپیئر کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے مشہور شاعر رابرٹ برنز کی سالگرہ بھی ہر سال جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔ جس موقع پر اسکاٹ لینڈ کی مشہور ڈش ہیگس تیار کی جاتی ہے۔ ہیگس رابرٹ برنز کے بچپن کی غربت کی علامت ہے۔ جب اس کے گھر کئی کئی روز تک گوشت نہیں پکتا تھا۔

ایک بار لندن میں میں نے ایک معلوماتی ڈیسک سے ڈکنز میوزیم کا پتہ معلوم کرنا چاہا تو اس نے پوچھا کون سا ڈکنز میوزیم؟ کیوں کہ لندن میں ایک نہیں کئی ڈکنز میوزیم ہیں۔ ڈوٹی اسٹریٹ پر واقع ڈکنز میوزیم ادب کے طلبا کے لئے ایک معقول تحقیقی ادارہ ہے۔ اس میوزیم میں ڈکنز کے ذاتی استعمال کا تمام گھریلو سامان' ان کی رائٹنگ ٹیبل اور کرسی' سبھی موجود ہیں۔ اسی طرح اسٹریٹ فورڈ میں واقع ولیم شیکسپیئر کے گھر کے برتن' جھولا اور لکڑی کا وہ ڈیسک بھی محفوظ کر لیا گیا ہے جس پر بیٹھ کر کم سن ولیم اسکول کا کام کرتا تھا۔

پیرس سے تیس میل کے فاصلے پر زرعی گاؤں اوو۔ سنعیے عواز کا ایک چھوٹا سا کیفے ہے جہاں کسان اور مزدور اپنی شامیں گزارتے تھے وہ اب "وین گاف ان" ہے۔ یہی وہ کیفے ہے جس کی پہلی منزل پر واقع کمرے میں وین گاف نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ اسی گاؤں کے مکئی کے کھیتوں اور گرجے کی تصویریں بنائی تھیں۔ اب اس کیفے میں تصاویر کی نمائشیں ہوتی ہیں۔ وین گاف کے کمرے میں اٹھارویں صدی کا کیلنڈر جوں کا توں آویزاں ہے۔

ہم نے کیا کیا۔!!

لوگ پوچھتے ہیں چغتائی کہاں رہتے تھے۔ ان کی تصویریں کہاں ملتی ہیں۔ ابن انشاء' ابراہیم جلیس کی یادگاریں کہاں ہیں۔ امانت علی کے ادارہ کلاسیکی موسیقی کا پتہ کیا ہے۔ استاد اللہ بخش کہاں پیدا ہوئے۔ احمد پرویز میوزیم کس شہر میں ہے۔ سبط حسن آڈیٹوریم کہاں ہے۔

کیا کسی کے پاس اس کا جواب ہے؟

ہاں ہم نے فیض فاؤنڈیشن ضرور بنائی۔ لاہور میں شاکر علی میوزیم ہے اور کراچی میں صادقین گیلری بھی۔ فیض فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سال میں ایک آدھ بار محفل موسیقی یا کبھی میموریل کلچر۔ فیض کی پذیرائی کے لئے کافی ہے کیا۔!! شاکر علی نے جو اپنی معاشی بدحالی کے باوجود بھٹے کی ناکارہ اور سستی اینٹوں سے جو اپنا گھر بنایا تھا اسے میوزیم بنا دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ بے اولاد تھے۔ ان کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ کراچی میں فریئرہال کو صادقین گیلری بنا دینا مجبوری تھی کہ صادقین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہال کی چھت پر جو خطاطی کی تھی اسے وہاں سے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ ورنہ اسلام آباد میں جس مکان کے در و دیوار پر صادقین نے خطاطی کی تھی اور اسے صادقین میوزیم کا نام دے دیا گیا تھا اسے بکنے سے کوئی نہ روک سکا کہ ان کی تصاویر کو وہاں سے ہٹانا آسان تھا۔

صادقین نے کبھی شادی نہیں کی۔ ان کے بھتیجے' بھتیجیاں ہی ان کے لئے اولاد کی طرح عزیز تھے۔ انہیں بھی اپنے چچا سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے اس محبت کا حق چکا دیا ہے۔ یہ ان کا فرض تھا کہ وہ ان کے نام اور فن کو زندہ رکھنے کے لئے صادقین اکادمی بنا دیتے۔ شاباش' سبحان اللہ

جالب کے وارثوں نے بھی جالب کے فن کو زندہ رکھنے کے لئے ایک تنظیم بنائی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اتنی محنت کی ہے کہ عنقریب جالب کمپلیکس تعمیر ہونے والا ہے۔ جالب کے انتقال کے بعد اس وقت کے وزیراعظم میاں نواز شریف حسب عادت ایک بھاری بھرکم چیک لے کر ان کی رہائش گاہ پر گئے تو جالب کی بیوہ نے وہ چیک انہیں لوٹا دیا۔ یہ سن کر اس عظیم خاتون کے لئے دل سے آفرین' کی آواز آتی تھی۔ لیکن پھر کیا ہوا کہ اب جالب کے وارث گلی گلی نگر نگر مستحقین میں انعامات بانٹتے پھرتے ہیں۔ ان میں جہانگیر بدر' آفتاب احمد شیرپاؤ جیسے نام آتے ہیں۔

اور صادقین کے وارثوں نے صادقین شادی ہال بنا دیا۔

ارے یار' تم لوگوں نے واقعی کمال کیا ہے۔ وہ شخص اگر اپنے کرتے پاجامے کو سو بار بھی لانڈری سے دھلواتا تو وہ ان میزپوشوں

باقی صفحہ 18 پر

کیالیاری ندی کے بچاؤ کی کوئی امید ہے

لیاری ندی کی آلودگی سے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں شہری کی خصوصی رپورٹ

لیاری ندی شہر کے شمالی اور مغربی حصوں کے سیوریج (جہاں شہر کی تقریباً ۶۰ فیصد آبادی رہتی ہے) اور سائٹ کے علاقے کے صنعتی فضلے پر مشتمل انتہائی زہر آلودہ ملغوبہ منوڑہ چینل میں انڈیلتی رہتی ہے۔ منوڑہ چینل لیاری ندی کے دہانے پر واقع ہے اور بندرگاہ کا کام دیتا ہے اس کے علاوہ اس میں مشرقی اور مغربی بیک واٹرز کے وسیع علاقے مثلاً چینا کریک اور بوٹ بیسن وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ لیاری ندی کے پانی میں آلودگی کا ۸۰ فیصد سائٹ کے علاقے کے صنعتی فضلے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

لیاری ندی کے پانی میں شامل ٹھوس مواد، بندرگاہ کے علاقے میں مٹی اور کیچڑ جمع ہو جانے کا ایک بڑا سبب ہے جس کی وجہ سے بندرگاہ کی سرگرمیوں میں خلل پڑتا ہے اور جمع شدہ مٹی اور کیچڑ کو مسلسل نکالتے رہنا پڑتا ہے۔ گردونواح کا حیاتیاتی نظام مثلاً دلدلی جنگلات اور ان پر پلنے والی بحری حیات بری طرح متاثر ہوتی ہے جس کا سبب بلاٹریٹ منٹ میونسپل اور صنعتی

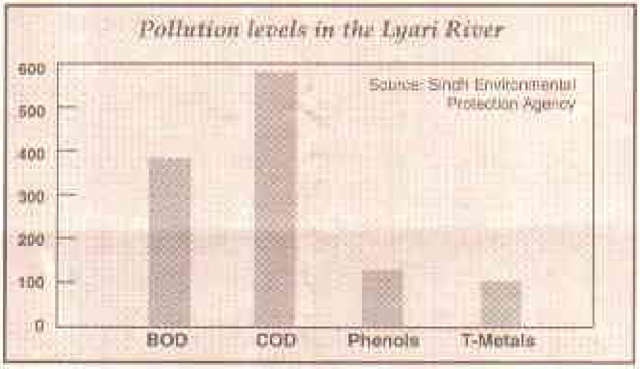

فضلہ سمندر میں بہا دینا ہے۔ تفریحی سرگرمیاں بھی اب خطرناک ہوتی جارہی ہیں کیونکہ اب بحری آلودگی کے اثرات سمندری ساحلوں پر بھی محسوس کئے جانے لگے ہیں۔

بحری آلودگی کے مسئلے سے قطع نظر لیاری ندی کے ساتھ ساتھ آباد نشیبی بستیوں میں صحت اور صفائی کے سنگین مسائل پیدا ہو رہے ہیں کیونکہ ان بستیوں کے باسی اپنی روزمرہ گھریلو ضروریات کے لئے لیاری ندی کا آلودہ پانی استعمال کرلیتے ہیں۔

ایک بڑا منصوبہ جس کا مقصد لیاری ندی میں گھریلو سیوریج کی آلودگی کو کم کرنا ہے، لیاری ندی کے بیڈ میں ٹرنک سیور بچھانے کا منصوبہ ہے۔ (کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ نے اس منصوبے کا ۷۵ فیصد کام مکمل کرلیا ہے) بعدازاں اسے ماری پوری پر زیرتعمیر سیوریج ٹریٹ منٹ پلانٹ سے ملا دیا جائے گا۔ یہ ٹرنک سیور شہر کے گھریلو سیوریج کو جمع کرے گا جو اس وقت لیاری ندی میں بہادیا جاتا ہے۔

تاہم صنعتی محاذ پر ابھی تک کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ حالانکہ آلودگی پر اس کا اثر کہیں زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ سائٹ کی انتظامیہ کے پاس اتنے مطلوبہ مالی وسائل نہیں ہیں کہ وہ کوئی بڑا آلودگی پر کنٹرول کا منصوبہ شروع کرسکے۔ لہٰذا اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ صنعتی ادارے خود ایسے فوری اقدامات کریں کہ ان سے خارج ہونے والے صنعتی فضلے کا مناسب ٹریٹ منٹ کیا جائے اور اس کے بعد ہی اسے لیاری ندی میں بہایا جائے۔

لیاری ندی کے کنارے آبادیاں

انٹرویو : ش۔ فرخ

کراچی میں شور کی آلودگی کے اسباب

شور کی آلودگی کے خلاف ادارہ تحفظ ماحول نے کئی اقدامات کئے کچھ عرصے قبل ادارے کی جانب سے باقاعدہ مہم چلائی گئی لیکن خاطرخواہ نتائج اخذ نہ ہوئے

آخر یہ منصوبہ کیوں ناکام ہوا؟

اس ضمن میں ای پی اے سندھ کی ڈائریکٹر جنرل مہتاب راشدی سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔

"ادارہ تحفظ ماحول کا کام مشورہ دینا اور رہنمائی کرنا ہے۔ اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری مقامی انتظامیہ اور متعلقہ اداروں کی ہے۔ ہم نے جب شور کی آلودگی کی خلاف مہم چلائی اور اس بارے میں ان سب سے میٹنگز کیں اور انہوں نے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ پھر عملاً" رضاکارانہ طور پر ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ ہمارے ساتھ کچھ این جی اوز بھی اس مہم میں شامل تھیں۔ نتیجتاً" ۲۰۔۲۵ ٹیمیں بنادی گئیں تاکہ وہ شور کی آلودگی کے سدباب کے لئے ای پی اے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ اس دوران ہم نے پولیس سے چالان کے اختیارات بھی لے لئے تھے۔ بہت سی گاڑیوں سے پریشر ہارن نکلوا دیئے۔ مگر شور کی آلودگی میں ۸۰ فیصد ذمہ داری رکشاؤں پر عائید ہوتی ہے۔ بلکہ سب سے پہلے تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ پیٹرول میں ملاوٹ کے سدباب کے لئے اقدامات کرے۔ پھر اس ملاوٹ شدہ پیٹرول میں مقررہ مقدار سے زیادہ موبل آئل ڈال دیا جائے گا تو پھر رکشا میں سے دھواں تو نکلے گا۔ درحقیقت رکشہ میں دو فیصد موبل آئل ڈالنا چاہئے۔ جبکہ عام طور پر بیس فیصد موبل آئل ملادیا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ رکشے کا سائلنسر نکال دیا جاتا ہے اس طرح وہ دھوں بھی دیتا ہے اور شور بھی مچاتا ہے"۔

سائلنسر کے بغیر رکشہ کو فٹ نس سرٹیفکیٹ کیسے مل جاتا ہے؟

"اس وقت کراچی میں کرائے پر سائلنسر دینا ایک اچھا خاصا کاروبار ہے۔ رکشہ میں کرائے کا سائلنسر لگوایا' فٹ نس سرٹیفکیٹ لیا اور دو گھنٹے بعد سائلنسر واپس کردیا۔ بلکہ کچھ ایسے واقعات بھی مشاہدے میں آئے ہیں کہ رکشہ میں بھٹے ٹھونس لئے جاتے ہیں۔ اس سے انجن کی آواز کم ہو جاتی ہے۔ چیکنگ کے بعد بھٹے نکال دیتے ہیں یہ کام ٹریفک پولیس کا ہے کہ وہ اس کی چیکنگ کرے"۔

لاہور اور کوئٹہ کے رکشہ شور بھی نہیں مچاتے اور دھواں بھی کم چھوڑتے ہیں۔ اگر کوئی قاعدہ قانون ان شہروں میں کام کر رہا ہے تو پھر کراچی میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

"ایک بات تو یہ کہ وہ چھوٹے شہر ہیں۔ فاصلے کم ہیں۔ رکشہ کا انجن وہی دو اسٹروک کا ہے جو و۔ سپا اسکوٹر کا ہے۔ اس پر بڑی باڈی لگادی گئی۔ اب ایک رکشہ ناظم آباد سے صدر تک آئے گا تو چھوٹے انجن کی ٹوٹ پھوٹ تو ہوگی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ رکشاؤں کو یا تو انجن تبدیل کرکے ۴ اسٹروک کا انجن لگایا جائے۔ موجودہ رکشاؤں کو چھوٹے شہروں میں بھیجیں اور ان کی بجائے چھوٹی ٹیکسیاں چلائی جائیں۔

"شور کی آلودگی کے خلاف مہم" پر منعقد ہونے والی تقریب میں یہ ذکر آیا تھا کہ جب بھی "شور یا دھوئیں" کی بات آتی ہے تو افتاد رکشہ والوں پر ہی پڑتی ہے۔ ان کا روزگار بھلا کیوں بند کیا جائے؟

"ٹھیک ہے۔ یہ ان کے روزگار کا مسئلہ ہے۔ پھر یہ ایک سستی سواری ہے۔ اکثر خواتین ٹیکسی کے بجائے رکشہ میں سفر کرتے ہوئے زیادہ محفوظ محسوس کرتی ہیں مگر رکشاؤں کے موجودہ انجن تبدیل کرنا ناگزیر ہے۔ اس انجن کے ساتھ تو ماحول آلودہ ضرور ہوگا"۔

مگر شہری ماحول کو خراب کرنے والے اور بھی بہت سے اسباب ہیں؟

ہم نے کالی تھیلیوں پر پابندی لگائی۔ اور.....

قطع کلامی معاف۔ پلاسٹک کی تھیلیاں تو اب بھی سڑکوں کے کنارے پڑی دکھائی دیتی ہیں!

"یہ کام بلدیہ کا ہے۔ تھیلیوں کے ساتھ اور بھی کوڑا کرکٹ ہوتا ہے۔ بلدیہ اگر اس کوڑے کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہوجائے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

صرف کالی تھیلیوں پر ہی پابندی کیوں؟

"پلاسٹک کی تھیلیاں بنانے کے لئے بہت سا استعمال شدہ مواد ری سائیکل کیا جاتا ہے۔ مگر کالی تھیلیوں میں گندگی کو ملا کر سیاہ رنگ ڈال دیا جاتا تھا۔ ان تھیلیوں میں کھانے پینے کی چیزیں' خصوصاً" گرم کھانا ڈالنا مضر صحت عمل تھا۔

"دراصل بہت سے منصوبے اس لئے ناکام ہو جاتے ہیں کہ ان کی تکمیل یا عمل درآمد کے لئے مناسب طور پر تیاری نہیں ہوتی۔ اب جبکہ این ای کیو ایس نافذ کردیا گیا ہے مگر ہمارے پاس لیبارٹریاں نہیں ہیں کہ صنعتی اخراج کی مناسب جانچ پڑتال کرسکیں۔ قانون کے اطلاق کے لئے مناسب میکانزم اور خلوص نیت کے علاوہ بدعنوانی کی روک تھام ضروری ہے۔ این ای کیو ایس تو اب آیا۔ ماحولیاتی ایکٹ ۹۶ کی منظوری بھی اب ہوئی لیکن پہلے سے فیکٹریوں کے قوانین موجود تھے۔ جن میں فیکٹری مزدوروں کی صحت اور دیگر امور کے بارے میں قواعد و ضوابط موجود ہیں لیکن عموماً" ہوتا یہ ہے کہ ہر ماہ ہیلتھ انسپکٹر آتا ہے اور اپنا بھتہ لے کر چلا جاتا ہے"۔

تو کیا یہ ذمہ داری ای پی اے کی نہیں کہ ان امور کی چیکنگ کرے؟

"ای پی اے کی کارکردگی خاطرخواہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک ماحولیات کی باقاعدہ وزارت نہیں ہے۔ جیسے ای پی اے سندھ پہلے ہاؤسنگ اور پلاننگ کے تحت کام کرتی تھی۔ اب اسے محکمہ جنگلات کے ساتھ منسلک کردیا گیا۔ جبکہ سندھ کے وزیر اعلیٰ اس کے انچارج ہیں۔ اگر الگ سے وزارت قائم کردی جائے تو بہت سے توجہ طلب امور پر بہتر طور پر کام کیا جاسکتا ہے نیز یہ کہ محکمے کے سربراہ کو فیصلے کا اختیار ہونا چاہئے۔

محکمہ جاتی مشکلات کے بارے میں مہتاب راشدی نے کہا کہ قانون پر عمل درآمد کے لئے لیبارٹری کے علاوہ شور اور فضائی آلودگی کی جانچ کے آلات اور اسٹاف کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ عوام میں ہر سطح پر ماحولیات کے بارے میں شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ سسٹم بنانے کی ضرورت ہے۔ بہرحال ہم اس کوشش میں ہیں کہ میڈیا' ورکشاپس اور سیمینارز کے ذریعے ماحولیاتی شعور کو فروغ دیا جائے۔ اس ضمن میں ہمیں آئی یو سی این کے ماہرین کا تعاون بھی حاصل ہے۔

شہری کی سرگرمیاں

قانونی شعبہ

قاضی فائز عیسیٰ، امبر علی بھائی، رولینڈ ڈسوزا، خطیب احمد، وکٹوریہ ڈسوزا

شہری برائے بہتر ماحول کا نام اب سرکاری اداروں میں مقبول و معروف ہو چکا ہے۔ کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی (کے بی سی اے) کے ایم سی کے نئے سیٹ اپ میں جن نئے افسران کی تقرری ہوئی ہے انہیں شہری کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب ناجائز تعمیراتی سرگرمیوں کے انسداد کے سلسلے میں کے بی سی اے سے رابطہ کرنا اور اس کی امداد حاصل کرنا زیادہ آسان ہو گیا ہے، یہ تبدیلیاں جون ۱۹۹۶ء میں رونما ہوئی ہیں ڈائریکٹر جنرل کے ڈی اے اور کنٹرولر بلڈنگز کے بی سی اے کے ساتھ ۱۱ جون ۱۹۹۶ء کو ہونے والی میٹنگ میں شہری برائے بہتر ماحول نے کے بی سی اے کو مبارک باد دی کہ اس نے شہر میں بیشتر غیر قانونی تعمیرات کو روک دیا ہے۔

اس میٹنگ میں جو دوسرے فیصلے کئے گئے وہ یہ تھے۔

الف) کے ڈی اے اور کے بی سی اے اور شہری سی بی ای نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وہ اپنا تعاون جاری رکھیں گے جس کے نتیجے میں گزشتہ سال کے دوران کراچی میں ناجائز اور غیر قانونی تعمیرات کرنے والے بلڈرز کو خاصی پسپائی اٹھانی پڑی۔

ب) تجویز کیا گیا کہ ڈائریکٹر جنرل کے ڈی اے اور چیف کنٹرولر آف بلڈنگ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے ملاقات کریں گے اور انہیں آگاہ کریں گے کہ عدالتوں کی جانب سے صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے احکامات کی آڑ لے کر کس طرح بڑے پیمانے پر غیر قانونی تعمیرات کی جا رہی ہیں۔

ج) این جی او نے ان اقدامات کو بھی سراہا جو کے بی سی نے حال ہی میں غیر قانونی تعمیرات کی روک تھام کے لئے شروع کیئے ہیں جن میں فیلڈ بکس کی باقاعدہ دیکھ بھال بلنتھ سرٹیفکیٹ کی توثیق، عوام کے لئے منظور شدہ بلڈنگ پلان کی نقول اور منصوبے کے بارے میں معلومات کا آسانی سے حصول پبلک انفارمیشن کاؤنٹرز کھولنا باقاعدگی کے ساتھ روز ناموں میں پبلک کی اشاعت ناجائز تعمیرات کی فہرست کے ساتھ اور شہریوں کے گروپ کی حمایت کے لئے ان کے ساتھ باقاعدگی سے میٹنگ کرنا۔

د) اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ ناجائز تعمیرات کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے کے بی سی اے کے کام میں ٹرانسپیرنسی بڑھانا ضروری ہے کیونکہ اس پھیلاؤ سے شہری ماحول اور بنیادی خدمات میں انحطاط آ رہا ہے۔

۸ اپریل کو کمشنر کے دفتر میں کراچی، شہری برائے بہتر ماحول اور گارڈن ایسٹ بلڈرز فورم کے درمیان ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات

کمشنر کراچی نے بلڈرز، ریذیڈنٹس، شہری سی بی ای اور انتظامیہ کے درمیان بالمشافہ گفتگو کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ اسی مسئلے کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ غیر قانونی تعمیرات کے مسئلے کے سلسلے میں یہی طریقہ اپنانا چاہیں گے۔

شہری برائے بہتر ماحول کی مسز امبر علی بھائی کا خیال تھا کہ کاغذی کارروائی کا طریق کار درست کیا جائے، ہر عمارت قانون کی حدود میں رہتے ہوئے تعمیر کی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی رہائشی عمارت کو کمرشل بنانا ہو تو اس کے بارے میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ معلوم کی جائے۔ یہ تجویز کیا گیا کہ شہریوں، شہری برائے بہتر ماحول اور انتظامیہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو کے بی سی اے کے انسپکٹروں کو فاؤل پلے سے روک سکے۔

شہری برائے بہتر ماحول نے بلڈرز کو یقین دہانی کرائی کہ وہ بلڈرز کی جائز اور قانونی کمائی میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بشرطیکہ انہیں بھی ایک اہم زندگی کے لئے عوام کی ضروریات اور رفاہ عامہ کا خیال ہو۔

کمشنر نے زور دیا کہ کے بی سی اے کے افسران کے منفی رویے کے خلاف مزاحمت کے لئے ایک مضبوط پریشر گروپ قائم کیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ بھی دیکھا جائے کہ بلڈر نیک نیتی سے کام لے رہا ہے اور آج ہی ایک کمیٹی قائم کی جائے جو اپنی تجاویز پیش کرے، اس میں ہر گروپ کے دو تین افراد شامل کئے جائیں۔

شہری برائے بہتر ماحول نے تجویز پیش کی کہ اگر تعمیرات عمودی ہوں تو ایسی صورت میں بنیادی ضروریات مثلاً ہوا، دھوپ، بجلی، گیس، سیوریج، کچرے کو ٹھکانے لگانے کا انتظام، لازمی کھلی جگہیں اور شہریوں کو بہتر ماحول فراہم کرنے کے لئے پارکوں اور کھیل کے میدانوں کا انتظام ہونا چاہئے۔ ناجائز تعمیرات کی روک تھام کے لئے جو نگراں کمیٹی قائم کی جائے اس میں کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ اور کے ای ایس سی کے نمائندوں کو بھی ارکان کی حیثیت سے شریک کیا جائے۔

واضح رہے کہ شہری برائے بہتر ماحول نے بلڈنگ کنٹرول کے معاملے میں پیش رفت کی ہے اور ایک ایسی حیثیت حاصل کر لی ہے جسے حکومت نے تسلیم کر لیا ہے۔ شہری ترقی اور افزائش سے متعلق تمام میٹنگوں اور سرگرمیوں میں اب شہری برائے بہتر ماحول کو باقاعدگی کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔

سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ایم مامون قاضی کے ساتھ میٹنگ کی تفصیلات

مینجنگ کمیٹی کے ارکان مسز امبر علی بھائی، مسٹر خطیب احمد اور مسٹر رولینڈ ڈی سوزا نے ۲۶ مئی ۹۶ء کو کراچی میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا مقصد چیف جسٹس کراچی بھر میں بڑھتی ہوئی غیر قانونی اور ناجائز تعمیرات کے بارے میں آگاہ کرنا تھا جن میں مندرجہ ذیل امور بھی شامل تھے۔

...... کے بی سی اے کے منظور شدہ نقشوں کی کھلم کھلا اور بڑے پیمانے پر خلاف ورزیاں

...... زمین کے استعمال میں غیر قانونی تبدیلیاں (رہائشی کو تجارتی میں تبدیل کرنا)

.... فلاحی پلاٹوں کی ناجائز تبدیلی (پارکوں کو تجارتی پلاٹوں میں تبدیل کرنا)

.... ناجائز اور غیر قانونی ریگولرائزیشن' سیاستدانوں اور نوکر شاہی کی مرضی سے خلاف ورزیوں کو نظرانداز کر دینا۔

عدالتوں کا وقار اور اختیار داؤ پر لگا ہوا ہے کیونکہ بلڈرز انہیں غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں اور ماحول کے تحفظ اور عوام کے حقوق کی حفاظت کے سلسلے میں عدالتوں کی اہلیت کے بارے میں عوام کا اعتماد کم ہوتا جارہا ہے۔ ان میں سے بیشتر مقدمات صرف حکام اور بلڈرز کا معاملہ نہیں بلکہ یہ پبلک انٹرسٹ کے مقدمات کی ذیل میں آتے ہیں۔

تجاویز

۱) جج کو شعوری طور پر خیال رکھنا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے حکم میں کسی عبوری حکم سے پہلے اس عمارت کی صحیح کیفیت درج کرنی چاہئے۔

۲) عبوری حکم میں Status-Quo لکھنے کے بجائے تمام پارٹیوں کے لئے مخصوص ہدایات واضح طور پر درج کی جائیں۔

۳) جہاں تک ممکن ہو عبوری احکامات بلڈرز کے حق میں جاری کئے جائیں' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ غیر جانبدار افراد اس عمارت کا معائنہ کریں یا اس کا فوٹوگرافک ثبوت پیش کیا جائے اور انہیں روکا جائے کہ وہ مزید تعمیر نہیں کریں گے اور تھرڈ پارٹی انٹرسٹ پیدا نہیں کریں گے اور عدالت یہ اطمینان کرلے کہ بلڈر کے پاس منظور شدہ پلان موجود ہے۔

۴) ایک اسٹینڈرڈ پروفارما تیار کیا جاسکتا ہے اور اس شخص کو دیا جاسکتا ہے جسے بلڈنگ کے معائنے کی ہدایت کی جائے۔

۵) مقدمات عام طور پر ماتحت عدالتوں میں دائر کئے جاتے ہیں کیونکہ وہاں Status-Quo کے احکامات آسانی سے مل جاتے ہیں اور ان میں تقریباً" مشینی انداز میں وقتاً" فوقتاً" توسیع بھی ہوتی رہتی ہے جبکہ امتناع کی درخواست کی میرٹ پر سماعت بھی نہیں ہوتی۔ عدالتوں کو سب سے پہلے اپنی جیورسڈکشن کا جائزہ لینا چاہئے اور بلڈر اور اس زمین کی مالیت کا بھی اندازہ پیش نظر رکھنا چاہئے جس کا بلڈر تحفظ چاہتا ہے۔

ہمارے خیال میں تو کسی بھی بلڈنگ کی مالیت پانچ لاکھ روپے سے کم نہیں ہے۔

۶) سندھ بلڈنگ کنٹرول آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کا تقاضہ ہے کہ کے بی سی اے کے این او سی کے بغیر کوئی بلڈنگ فروخت نہیں کی جاسکتی اور کے بی سی اے کے جاری کردہ قبضے کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی عمارت پر قبضہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا جب لوگ کسی بلڈنگ یا اس کے کسی حصے پر قابض ہونے یا اس میں دلچسپی رکھنے کا دعویٰ کریں تو ان دفعات کو پیش نظر رکھا جائے۔

۷) بلڈنگز کی تعمیر سے متعلق ایسے تمام مقدمات جن میں ریذیڈنٹس بھی دلچسپی رکھتے ہوں ان کو "شارٹ کاز" معاملے کے طور پر نمٹانے کی ہدایت کی جائے۔

۸) عدالت کے سی بی اے کو ہدایت کرے کہ اگر Status-Quo کی کوئی خلاف ورزی کی جارہی ہو تو وہ فوری طور پر عدالت کو مطلع کرے۔

۹) سندھ بلڈنگ کنٹرول آرڈی نینس ۱۹۷۹ء کے تحت مقدمات کے لئے خصوصی مجسٹریٹ مقرر کئے جائیں۔

۱۰) جب حکم امتناعی کی خلاف ورزی کی جائے تو ایسی صورت میں عدالت جائیداد کی قرقی کے احکامات دے۔

۱۱) ممبر انسپکشن ٹیم کو جاری کئے جانے والے حکم امتناعی اور متعلقہ حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں اور آنریبل چیف جسٹس کو مطلع کرنا چاہئے۔

میٹنگ کے نتائج

چیف جسٹس نے شہری برائے بہتر ماحول کے ارکان کا موقف بڑے تحمل سے سنا اور غیر منظم شہری افزائش اور ناجائز تعمیرات کے خلاف جدوجہد میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

چیف جسٹس نے تجویز پیش کی کہ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے ایک سینئر جج اور ایک انسپکشن ٹیم مقرر کی جائے۔

شہری برائے بہتر ماحول نے چیف جسٹس کو "کراچی کی حکومت میں شہریوں کا کردار" کے موضوع پر ہونے والے سیمینار میں مہمان خصوصی بننے کی دعوت دی۔ یہ سیمینار ستمبر ۱۹۹۶ء میں ہوگا۔ چیف جسٹس جولائی کے آخر تک اس سلسلے میں تاریخ اور وقت دیں گے۔

کمشنر کراچی ڈویژن کے ساتھ ۸ جولائی ۱۹۹۶ء کو ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات

۸ جولائی ۱۹۹۶ء کو شہری برائے بہتر ماحول کے ارکان کو کمشنر کراچی' ضلعی انتظامیہ' پولیس اور کے بی سی اے کے افسران کی میٹنگ میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ یہ اجلاس اس لئے بلایا گیا تھا کہ شہری اور علاقے کے باشندے گزشتہ سات ماہ سے شکایات کر رہے تھے کہ مزار قائداعظم کے قریب جمشید کوارٹرز میں پانچ غیر قانونی عمارات تعمیر کی جارہی ہیں' لیکن کوئی شنوائی نہیں۔

شہری سی بی ای نے وضاحت طلب کی کہ کہ ہائی کورٹ اور ماتحت عدالتوں کے Status-Quo آرڈرز کی بلڈرز کیوں خلاف ورزی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے انتظامیہ کو شہر میں غیر قانونی تعمیرات کے پھیلاؤ کو روکنے کی اپنی قانونی ذمہ داری کو پورا کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ کے بی سی اے اور انتظامیہ نے وضاحت کی کہ بیک وقت مختلف عدالتوں کی جانب سے متعدد احکامات نہ صرف مبہم بلکہ متضاد ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے صرف انتظامیہ اپنی قانونی کارروائی سے باز رہتی ہے جبکہ بلڈرز عدالتی احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور تعمیراتی کام جاری رکھتے ہیں۔

کمشنر کراچی نے معذوری ظاہر کی کہ وہ بلڈرز کو خلاف ورزیوں سے نہیں روک سکتے کیونکہ بلڈرز عدالتوں میں مقدمات دائر کر دیتے ہیں جن میں انہیں Status-Quo کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔

یہ میٹنگ مایوسی کے عالم میں ختم ہوئی کیونکہ عدالتیں اس الجھے ہوئے معاملے کو نمٹانے کے قابل نہیں ہیں۔ شہری برائے بہتر ماحول نے اس معاملے میں چیف جسٹس سے مداخلت کی درخواست کی ہے۔

میڈیا اینڈ بیرونی روابط

حمیرا رحمان' حسن جعفری

شہری سی بی ای نے جنوری/مارچ کے مہینوں کے اردو اور سندھی نیوز لیٹرز شائع کئے انگلش نیوز لیٹر جولائی ۱۹۹۶ء میں شائع کیا گیا۔ اپنی معمول کی اشاعتوں کے علاوہ شہری سی بی ای نے "پاور پلانٹس" اور "شجرکاری" کے بارے میں بروشرز شائع کئے۔ ان کا مقصد کراچی کے نواح میں پاور پلانٹس کی تنصیب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آلودگی کے خطرات کے بارے میں شعور پیدا کرنا اور عوام کو درختوں کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔

باقی صفحہ 17 پر